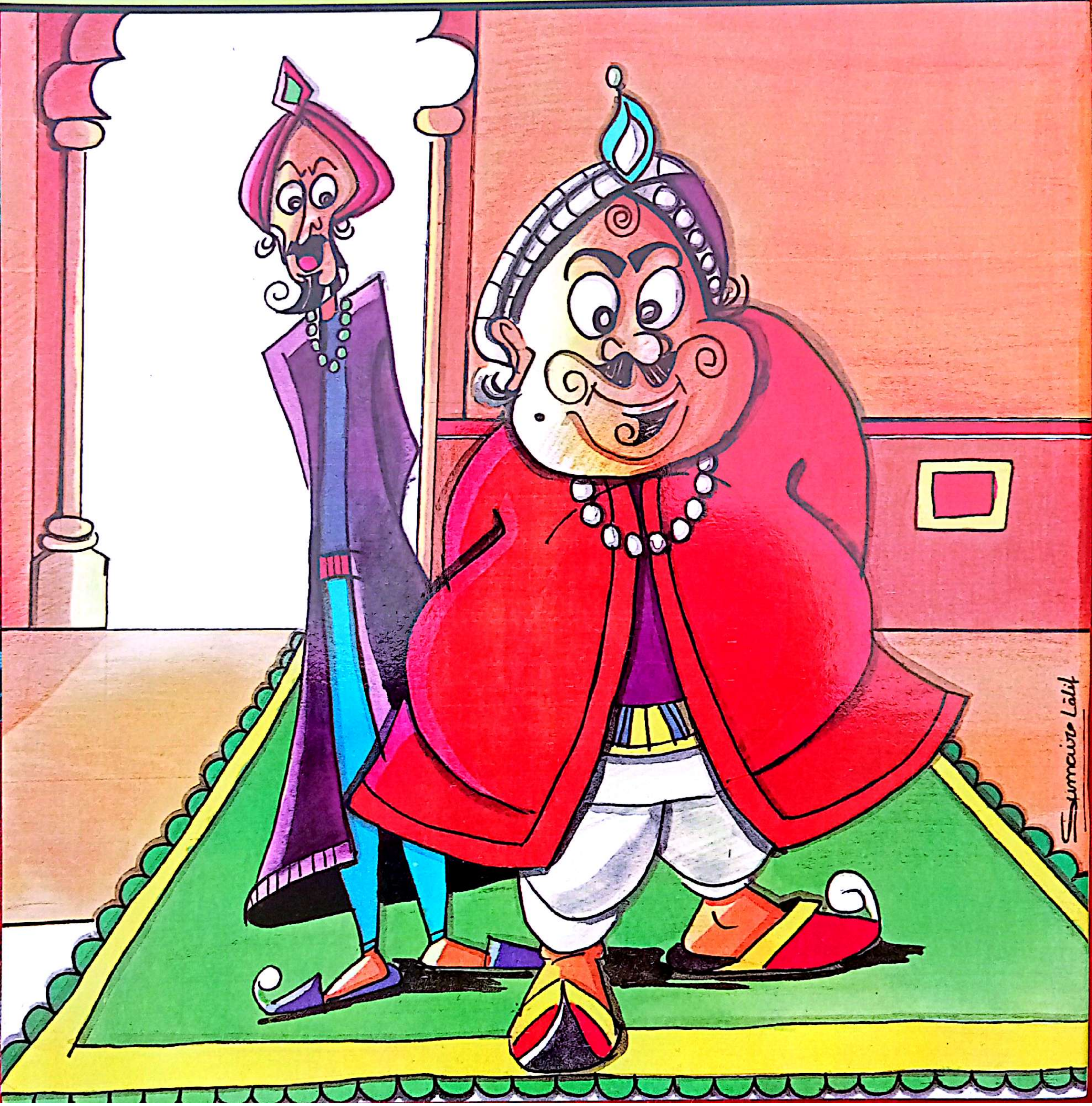
الٹا نگر کے موٹو شاہ



اُلٹا نگر کے موٹو شاہ



اُلٹا نگر کے بادشاہ سلامت جب اکڑ کر دربار میں داخل ہوئے تو نقیب نے کڑک کر کہا ''باادب، باملاحظہ ہوشیار۔ شہنشاہِ معظم، اعلیٰ حضرت فرماں روائے اُلٹا نگر تشریف لاتے۔۔۔!''

پکارنے والا ابھی پوری بات بھی نہ کر پایا تھا کہ بادشاہ سلامت دھڑام سے وزیرِاعظم کے قدموں میں گر پڑے۔

وزیراعظم نے چار پانچ سپاہیوں کی مدد سے حضور کو بڑی مشکل سے اٹھایا۔

بادشاہ سلامت کانپتے ہوئے اُٹھے اور ڈانٹ کر بولے ''یہ کون بدتمیز ہمارے سامنے گر پڑا؟'' وزیراعظم سر کھجا کر بولے

''میرے خیال میں تو حضور خود ہی گر پڑے تھے۔ ارر۔ معاف۔''

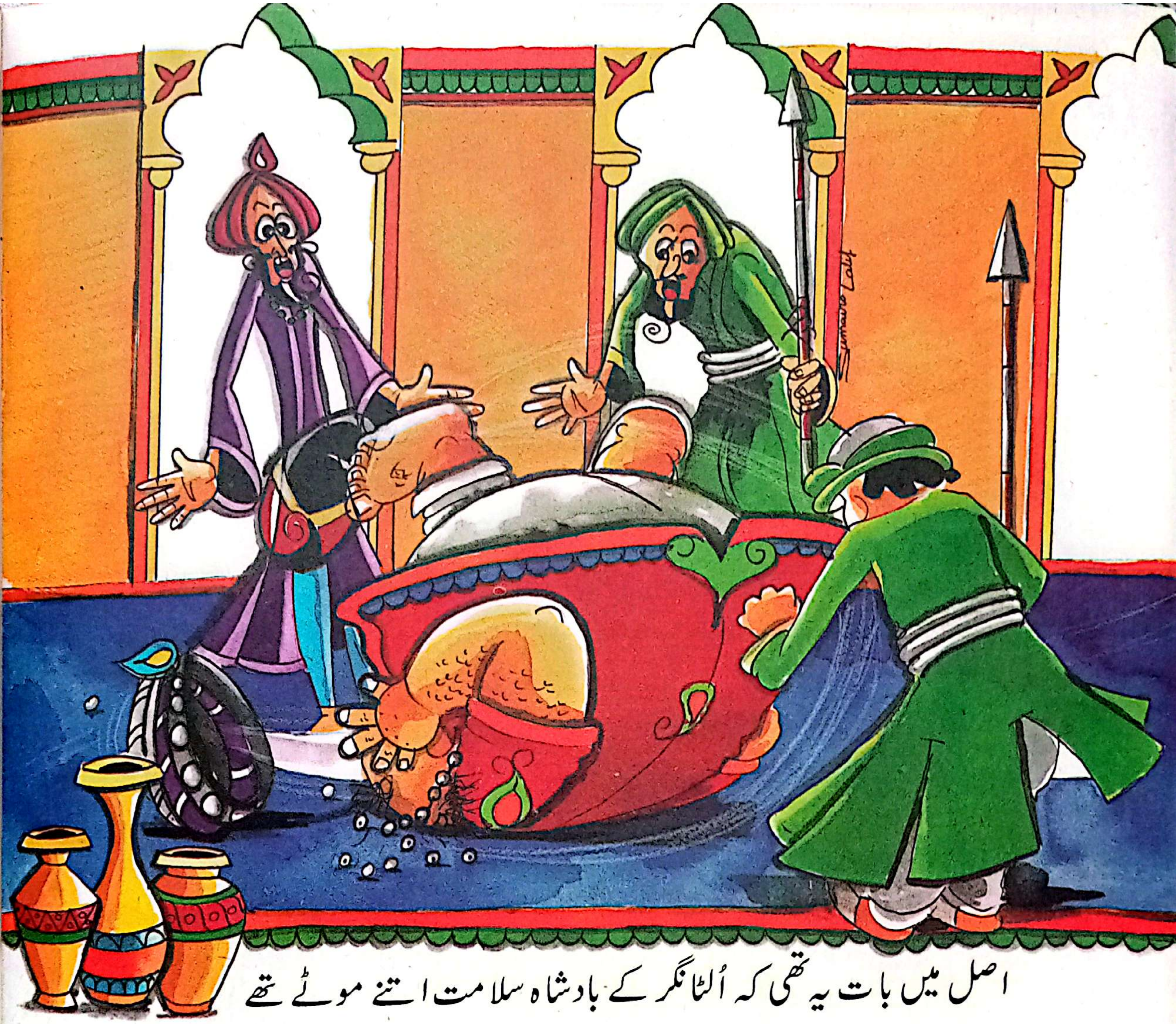
''کون ہم؟ یعنی مابدولت؟'' وہ چیخ کر بولے۔

''ٹھہر جا! تجھے اس گستاخی کا ہم ابھی مزا چکھاتے ہیں۔ کوئی ہے؟''

دو سپاہیوں نے آکر فرشی سلام کیا۔ ''لے جاؤ اسے۔'' بادشاہ سلامت نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''اور اس کی ناک میں بُھس بھر دو۔''

سپاہیوں نے کچھ دیر کی تو بادشاہ نے اُچھل کر فرمایا۔

''میں کہتا ہوں۔ لے جاؤ۔'' اور پھر دھڑام سے نیچے گر پڑے۔



اصل میں بات یہ تھی کہ اُلٹا نگر کے بادشاہ سلامت اتنے موٹے تھے کہ بس بہت ہی موٹے تھے۔ ایک تو بے تحاشا موٹاپا، اور دوسرے آپ کی داہنی ٹانگ بائیں ٹانگ سے کچھ چھوٹی تھی اس لئے بادشاہ سلامت کو ذرا سی بھی ٹھوکر لگتی تو آپ بھَد سے نیچے گر پڑتے اور فٹ بال کی طرح زمین پر لڑھکتے پھرتے۔ اس وقت آپ کے سامنے کسی کا آجانا غضب ہی ہو جاتا۔ گرنے کا سارا غصّہ اس پر اتارتے اور جب تک اس کی ناک میں بھُس نہ بھروا دیتے، تب تک چین نہ لیتے۔ چنانچہ کوئی درباری ایسا نہ تھا جس کی ناک میں بھُس نہ بھرا گیا ہو۔

جسم موٹا ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہ سلامت کی عقل بھی بہت موٹی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بادشاہ سلامت کسی کرسی پر بیٹھتے اور وہ آپ کے بوجھ سے چرَ چرَا کر ٹوٹ جاتی تو بادشاہ سلامت نہ صرف کرسی بنانے والے کی بلکہ اس کے پورے خاندان کی ناک میں بُھس بھر وادیتے۔

اسی لیے ملکہ نے محل کی ساری کرسیاں اور مسہریاں لوہے کی بنوادی تھیں۔ لیکن اس پر بھی کبھی نہ کبھی ایک آدھ کرسی یا مسہری بادشاہ سلامت کے بوجھ سے ٹوٹ ہی جاتی۔ یہ دیکھ کر بعض آدمی تو سوچنے لگتے کہ بادشاہ سلامت موٹے زیادہ ہیں یا بھاری۔

بادشاہ سلامت کے بے تحاشا موٹاپے اور بے عقلی سے ویسے تو ساری رعایا ہی پریشان تھی۔ مگر وزیرِاعظم اور ملکہ کی تو جان آفت میں تھی اور جب سے بادشاہ سلامت نے وزیرِاعظم صاحب کی ناک میں بُھس بھروُایا تھا، تب سے تو وہ اور بھی ڈرنے لگے تھے اور ہر وقت ایسی تجویزیں سوچتے رہتے کہ کسی طرح بادشاہ سلامت کا موٹاپا ختم ہو، تاکہ ان کی اور رعایا کی جان اس مصیبت سے چھوٹے۔
ایک دن ملکۂ عالیہ کے پاس وزیرِاعظم گھبرائے ہوئے تشریف لائے اور کراہتے ہوئے بولے، ''ارے ملکۂ عالیہ! آپ نے کچھ اور بھی سنا؟''
''کیا؟'' ملکہ ہڑبڑا کر بولیں۔
''کیا بتاؤں ملکۂ عالیہ!'' وزیرِاعظم پیٹھ کھجا کر بولے ''حضور بادشاہ سلامت نے تو لوگوں کی زندگیاں حرام کردی ہیں۔''
''کچھ کہو گے بھی کہ۔۔'' ملکہ خفا ہونے لگیں۔



’’کہوں کیا ملکۂ عالیہ؟‘‘ وزیرِ اعظم نے منہ بسور کر کہا۔ ’’کسی کم بخت نے حضور سے یہ کہہ دیا کہ شہر کے تمام بچے آپ کو ’’موٹو شاہ‘‘ کہتے ہیں۔
بس آپ نے فوج کو حکم دے دیا ہے کہ وہ سارے شہر کے بچوں کو پکڑ کر ان کی ناک میں بُھس بھر دے۔‘‘ ’’یہ تو بڑی بری بات ہوئی۔‘‘ ملکۂ نے ڈرتے ہوئے کہا۔ ’’اس سے تو رعایا میں بے چینی پھیل جائے گی۔‘‘
’’جی ہاں! اور کچھ عجب نہیں کہ لوگ حکومت کے خلاف بغاوت کر دیں۔‘‘ وزیرِ اعظم صاحب بولے۔

''بغاوت ۔۔؟'' ملکہ سہم گئیں۔

''جی ہاں! بغاوت ۔۔'' وزیرِاعظم نے جوش میں آکر میز پر مُکا لگایا اور جب چوٹ لگی تو ہاتھ سہلانے لگے۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' ملکہ نے پوچھا۔

وزیرِاعظم سوچ کر بولے۔ ''میرے خیال میں تو بادشاہ سلامت کے دُبلا ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ حضور کو روٹی ذرا کم دیا کریں۔'' ملکہ تُنن فُن کر بولیں۔

''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ بادشاہ سلامت میری ناک میں بھی بُھس بھر وادیں؟''

''ارے نہیں ملکۂ عالیہ!'' وزیرِاعظم سٹپٹا کر بولے۔

'' پھر ہمیں کوئی اور ہی تدبیر سوچنی پڑے گی۔''

اتنے میں ایک نوکر بھاگا ہوا ملکۂ عالیہ کے پاس حاضر ہوا۔

''ملکۂ عالیہ آپ کو بادشاہ سلامت یاد فرمارہے ہیں۔''

ملکۂ جلدی سے بولیں ''ابھی آتی ہوں۔''

نوکر چلا گیا تو ملکہ وزیرِاعظم سے بولیں۔

''اُلو کی طرح میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ کچھ بولو؟''

وزیرِاعظم نے پہلے کچھ دیر سوچا اور پھر ایک دم خوشی کا نعرہ مار کر بولے۔

''آہا! ملکۂ عالیہ! ایک بڑی اچھی ترکیب دماغ میں آئی ہے۔ شہر سے کچھ دور جو پہاڑ ہے، اس میں ایک بڑا زبردست جادوگر رہتا ہے۔ اگر اس سے مدد طلب کی جائے تو شاید وہ کوئی ایسی دوا یا منتر بتادے،



جس سے بادشاہ سلامت کا موٹاپا کم ہو سکے۔''
ملکہ خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولیں ''بس بالکل ٹھیک ہے۔
تم آج ہی اور ابھی اس کے پاس جاؤ۔''
وزیرِاعظم صاحب نے جھک کر سلام کیا اور چلے آئے۔
اب یہ بھی کچھ اتفاق تھا کہ بادشاہ سلامت جتنے موٹے تھے وزیرِاعظم صاحب
اتنے ہی دُبلے پتلے اور دھان پان تھے۔

انہوں نے سوچا کہ اگر میرا بھی دُبلا پن دُور ہو جائے اور میں ذرا سا موٹا ہو جاؤں تو کیا ہی اچھی بات ہو۔ یہ سوچ کر وہ خوشی سے اُچھل پڑے

اور جادوگر کو سارا حال کہہ سنایا۔

''اچھا یہ بات ہے۔'' جادوگر اپنی خوفناک آنکھیں گھما کر بولا

''یہ لو موٹا ہونے کی دوا۔ اگر چھپکلی بھی کھائے تو پھول کر ہاتھی ہو جائے۔

اور یہ لو دُبلا ہونے کی دوا۔

اگر اسے ہاتھی بھی کھائے تو پسو بن جائے۔''

وزیرِاعظم خوشی خوشی دونوں دوائیں لے کر چلے آئے۔

مگر آکر یہ بھول گئے کہ موٹا ہونے کی دوا کون سی ہے اور

دُبلا ہونے کی کون سی۔ بُھولے سے بادشاہ سلامت والی دوا تو وہ خود چڑھا گئے

اور اپنے والی دوا بادشاہ سلامت کو دودھ میں ملا کر پلادی اور

نتیجہ کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ بادشاہ سلامت کا

پیٹ پھول رہا ہے۔ گھبرا کر بولے ''ارے حضور! آپ کا پیٹ!''

بادشاہ سلامت جھلا کر بولے ''کم بخت میرا پیٹ دیکھ رہا ہے۔

تو اپنے آپ کو تو دیکھ'' وزیرِاعظم صاحب نے گھبرا کر اپنے اوپر نظر ڈالی۔

تو یہ دیکھ کر ان کی روح فنا ہو گئی کہ وہ اور دبلے پتلے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد بادشاہ سلامت تو پھول کر غبارہ ہو گئے اور

وزیرِاعظم سوکھ کر ہڈیوں کا پنجر۔ جب وزیرِاعظم کا سارا گوشت گھل گیا اور



صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں تو وزیرِ اعظم کا قد گھٹنا شروع ہوا اور گھنٹہ بھر کے بعد آپ کا قد دو فٹ رہ گیا اور بادشاہ سلامت کی توند چھت سے جا لگی۔

اور پھر اِتنے زور کا دھماکہ ہوا کہ سارا شہر ہل گیا۔

تمام فوج، امراء اور لوگ دوڑ پڑے۔ آکر کیا دیکھتے ہیں کہ بادشاہ سلامت تو پھٹے پڑے ہیں اور ان کے پاس ایک چیونٹی رینگ رہی ہے۔

یہ وزیرِ اعظم تھے جو گھٹتے گھٹتے چیونٹی کے برابر رہ گئے تھے۔



چچا بُھلکڑ

''کھٹ، کھٹ، کھٹ۔''

دروازے پر مخصوص آواز گونج رہی تھی۔

سب بچے ایک ساتھ چلائے، ''چچا بُھلکڑ آگئے! چچا بُھلکڑ آگئے!'' گیٹ پر گھنٹی لگی تھی۔ مگر گھنٹی بجانے کی زِحمت چچا بُھلکڑ نے کبھی نہ کی تھی۔ یہ ان کی عادت تھی کہ وہ مخصوص انداز میں دروازہ کھٹکھٹاتے۔

بچوں نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ چچا بُھلکڑ کی وہی بے ڈھنگی چال۔ سر دائیں بائیں گھومتا ہوا۔ خود بھی لہراتے ہوئے آئے اور آتے ہی سامنے پڑی کرسی پر ڈھیر ہوگئے۔ نہ سلام نہ دعا۔ امی اندر سے نکل کر آئیں۔

''ارے! شاد علی۔ تم کب آئے؟'' امی ان کا پورا نام لیتی تھیں۔

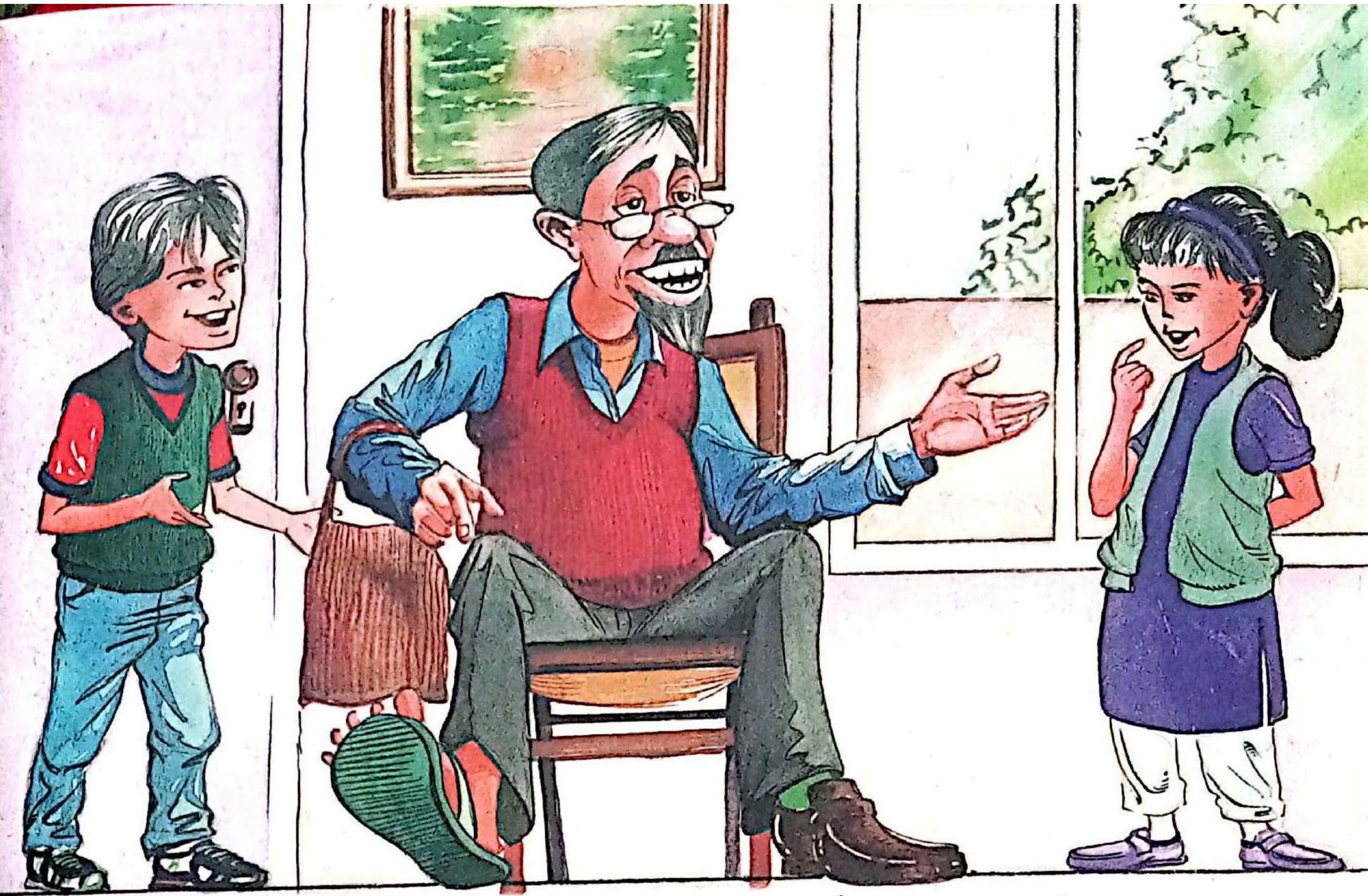
''ابھی آیا ہوں، بھابھی'' انھوں نے پیلے پیلے دانت نکال دیے۔

اتنے میں صفدر کی نظر ان کے پاؤں پر پڑی، ''ارے! چچا یہ کیا؟''

اب امی نے بھی ان کے پاؤں کی طرف دیکھا۔ چچا کے ایک پاؤں میں چپل تھی اور دوسرے پاؤں میں گھسا ہوا جوتا۔

''شاد علی! یہ کیا؟'' امی نے بھی حیرت سے کہا۔

''اوہو! بھول گیا، بھابی۔ بالکل بھول گیا۔ ایک چپل اُتاری، جوتا پہنا اور دوسری اُتارنا بھول گیا۔'' ''بھئی، حد ہوگئی، شاد علی! اپنی بھولنے کی عادت دُرست کرو۔



یہ بچے تمہیں اسی لئے چچا بُھلکڑ کہتے ہیں۔''

اب چچا بُھلکڑ ہیں کہ آرام سے دانت نکالے ہنس رہے ہیں۔ انہیں اپنے اس خطاب پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ کیوں کہ وہ اس گھر کے خلوص اور محبت سے بھی واقف تھے۔ بچے انہیں بہر حال پسند کرتے تھے اور خاطر مدارات میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ شاد علی ان بچوں کے سگے چچا نہ تھے۔ بس رشتے داری تھی۔

آج امی نے گاجر کا مزے دار حلوا بنایا تھا۔ انہوں نے شاکرہ سے کہا

''جاؤ بیٹی اپنے چچا کے لیے سلیقے سے گاجر کا حلوا لاؤ۔''

شاکرہ بھاگ کر گئی۔ ملیحہ نے چائے کا پانی چولھے پر رکھا۔ چائے تیار ہوئی۔ حلوا پلیٹ میں نکالا گیا۔ ٹرے کو سلیقے سے سجایا گیا۔ صفدر نے چھوٹی میز چچا بُھلکڑ کے

پاس لا کر رکھی۔ ملیحہ ٹرے لے آئی۔ لیجیے جناب چچا بُھلکڑ کی خاطر شروع ہو گئی۔
اب وہ مزے لے لے کر حلوا کھا رہے ہیں اور دنیا جہان کی باتیں بھی کر رہے ہیں۔
تھوڑی دیر بعد چچا بُھلکڑ چلے گئے مگر اپنا تھیلا بھول گئے۔ ہو سکتا ہے اس میں کوئی ضروری سامان ہو۔ مگر بھولنے کی عادت جو ٹھہری۔

ان کے جانے کے بعد صفدر نے کہا "امی، چچا بھی عجیب ہیں۔ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ پھر صفائی کا بھی انہیں کچھ خیال نہیں۔ آپ ان کے لیے اتنا اہتمام کیوں کرتی ہیں؟"

"بیٹا، وہ تمہارے چچا ہیں، رشتے ہی کے سہی۔ ان کی عزت کرنا تمہارا فرض ہے اور پھر سلیقہ اگر ان میں نہیں تو کیا ہم بھی بے سلیقہ بن جائیں؟ نہیں، بیٹا۔ یاد رکھو! اگر زندگی میں تم عزت چاہتے ہو تو دوسروں کی عزت کرو۔ اگر محبت کی طلب ہے تو دوسروں سے محبت کرو۔ غرض وہ سب کچھ جو تم اپنے لیے چاہتے ہو، پہلے دوسروں کو دو۔"
صفدر، شاکرہ اور ملیحہ ابھی کم عمر تھے۔ انہوں نے امی کی باتوں کو غور سے سنا۔
وہ ہمیشہ اچھی باتیں بتاتی تھیں۔

چچا بُھلکڑ جوان آدمی تھے۔ ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ ایک کمرے کے گھر میں تنہا رہتے تھے۔ معمولی سی نوکری تھی۔ دراصل حالات نے ان کا ساتھ نہ دیا۔
پڑھائی ادھوری رہ گئی۔ سنا تھا ایف۔ اے کے امتحان میں ایک پرچہ دینا بھول گئے تھے۔ اس لیے فیل ہو گئے۔ پھر دل برداشتہ ہو کر پڑھائی ترک کر دی اور ایک دفتر میں نوکری کر لی۔ یوں زندگی کے دن گزر رہے تھے۔



ایک روز کیا دیکھتے ہیں کہ رات کو چچا بُھلکڑ چلے آ رہے ہیں۔

ہاتھ میں لال ٹین تھام رکھی تھی۔ حسب معمول بچے ان کے پاس آ گئے۔

''آہا! آج تو چچا لال ٹین لائے ہیں۔'' ''ارے، میاں، یہ لال ٹین کس لیے؟''

ابا نے تعجب سے پوچھا۔ ''بھائی جان، دراصل مجھے رات کو ٹھیک سے نظر نہیں آتا،

اس لیے لال ٹین ساتھ لے آیا۔''

''یہ اچھا کیا کہ لال ٹین لے کر نکلے۔ مگر میاں تم نے کچھ علاج کروایا ہوتا۔''

چچا بُھلکڑ خاموش ہو گئے۔ وہ دوا اور علاج کے قائل نہ تھے۔ صفدر نے چچا سے کہا

''چچا جان، آپ ٹارچ کیوں نہیں رکھتے؟'' چچا بُھلکڑ ہنس پڑے اور بولے

''بس یہی لال ٹین ٹھیک ہے۔ بجلی چلی جاتی ہے تو لال ٹین جلا لیتا ہوں۔

آج بھی بجلی نہ تھی۔ لال ٹین جل رہی تھی۔ وہی ساتھ لے آیا۔''

''ٹھیک ہے۔ لال ٹین اچھی چیز ہے۔'' امی نے بات ختم کی۔

چچا بُھلکڑ کو بچوں نے زبردستی کھانے پر روک لیا۔ انہوں نے خوش ہو کر رات کا کھانا کھایا اور چلے گئے۔ مگر اپنی لال ٹین بھول گئے۔ اس پر امی اور ابو کو بھی ہنسی آ گئی۔

امی کو چچا کی تنہا زندگی پر ترس آتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان کی شادی کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ چچا کسی طور پر راضی نہ تھے۔ مگر انہیں امی کی ضد پر راضی ہونا پڑا۔ آخر امی نے بھی ان کے لیے دُلہن ڈھونڈ نکالی۔ بچوں کو ایک مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے کہا: ''چچا، آپ بارات لے جانا نہ بھول جایئے گا۔''

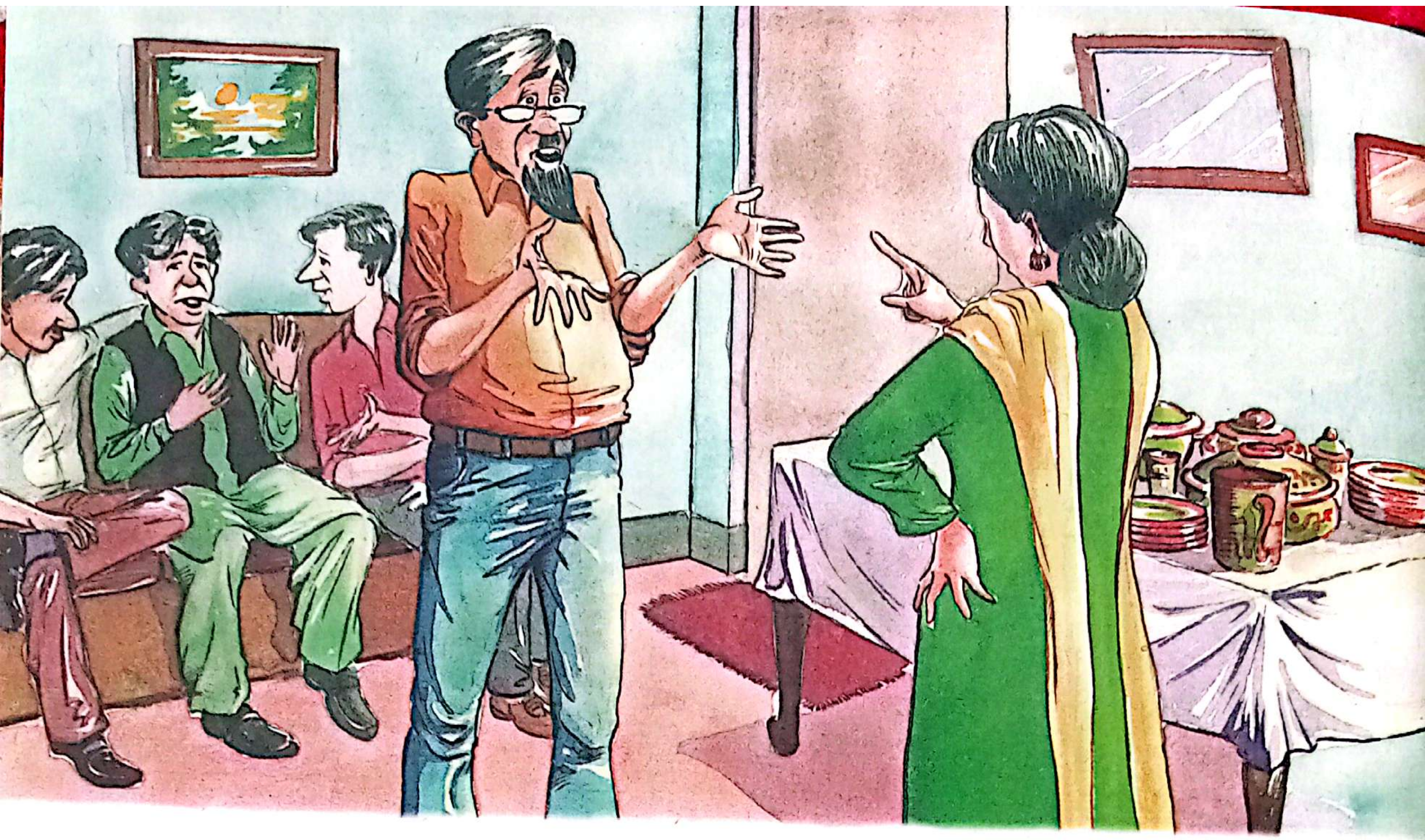
امی نے انہیں ڈانٹا ''مت تنگ کرو بے چارے کو۔ بھلا کوئی بارات بھی بھول سکتا ہے؟''

چچا بُھلکڑ ان دنوں بہت خوش تھے۔ امی نے ہی شادی کا سب انتظام کیا تھا۔

آخر خیریت سے شادی ہو گئی اور چچا بُھلکڑ کا گھر بس گیا۔ وہ اپنے گھر میں خوش تھے۔ ان کے بھولنے کی عادت کے متعلق ان کی بیوی حُمیرا کو بتا دیا گیا تھا۔ شادی کے فوراً بعد چچا سسرال چلے گئے۔ سسرال میں صرف بوڑھی ساس تھیں۔ انہیں سہارا مل گیا اور چچا بُھلکڑ کو رہنے کے لیے مفت کا گھر۔ اب امی کو یہ فکر ہوئی کہ شاد علی اور ان کی دلہن کی دعوت کرنی چاہیے۔ چنانچہ جمعہ کو دعوت دی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ چچا بُھلکڑ کو تاکید کی گئی کہ ساس کو بھی ساتھ لائیں اور دلہن اچھا جوڑا پہن کر آئیں۔ کچھ اور لوگوں کو بھی امی نے اسی دعوت پر بلایا۔ انہوں نے دعوت کا انتظام بہت اعلیٰ کیا، کیوں کہ اس گھر کے علاوہ انہیں پوچھنے والا کوئی اور نہ تھا۔

رات ہو گئی تھی اور ابھی تک چچا نہ آئے تھے۔ دوسرے لوگ آ چکے تھے۔
ایک بچے نے بے چینی سے کہا ''امی، کہیں چچا بھول نہ گئے ہوں۔''
''ارے نہیں۔ اب ایسے بھی بُھلکڑ نہیں ہیں'' امی نے ہنس کر کہا۔ دراصل ان کا گھر بہت دور ہے۔ آنے میں وقت لگے گا اور پھر غریب کو سواری کا مسئلہ بھی تھا۔
ابھی امی نے یہ بات کہی تھی کہ گیٹ پر مخصوص آواز اُبھری۔
''کھَٹ، کھَٹ، کھَٹ۔'' بچے بھاگ کر دروازے پر گئے، گیٹ کھولا اور پھر حیرت سے چلائے ارے! یہ کیا؟ چچا اکیلے؟''
''دلہن کہاں ہیں؟'' ''اماں کہاں ہیں؟'' امی نے پوچھا۔
اب تو چچا بُھلکڑ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر بولے ''افوہ! انہیں تو میں گھر بھول آیا۔''
''کیا مطلب؟'' امی کچھ نہ سمجھیں۔
''وہ تیار بیٹھی تھیں۔ میں ٹیکسی لینے گھر سے نکلا۔ ٹیکسی لی، خود بیٹھا اور یہاں آ گیا۔''
''بھئی، آج تو تم نے حد ہی کر دی، شاد علی! اب وہ کیسے آئیں گی؟ اتنا وقت بھی نہیں کہ تم دوبارہ جاؤ اور انہیں لے کر '

چچا بُھلکڑ سر جُھکائے شرمندہ شرمندہ بیٹھے تھے۔ آج کی بھول شاید ان کے لیے بھی تکلیف دہ تھی۔ کتنے چاؤ سے بھابھی نے دعوت کا انتظام کیا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ سارے مہمان دم بخود، امی پریشان بچے مایوس اور چچا بُھلکڑ شرمندہ، پورا ماحول افسُردہ تھا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔



''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اتنی دور کا فاصلہ ہے۔ شاد علی کو کھانا کھلا دو۔
مہمان بھی دیر سے بیٹھے ہیں۔'' ابا جان نے کہا۔
بے دلی کے ساتھ امی اُٹھ کر گئیں۔ کھانا نکالا جانے لگا۔ کھانا لگ گیا تو امی نے
مہمانوں سے کہا ''تشریف لائیے۔'' اتنے میں گھنٹی بجی۔
''ارے! اب کون آ گیا!'' امی نے کہا۔ صفدر نے دروازہ کھولا اور بچوں نے خوشی
سے نعرہ لگایا ''دُلہن چچی آ گئیں! دُلہن چچی آ گئیں!''

دُلہن اپنی ماں کے ساتھ رِکشے میں آئی تھیں۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ
شاد علی انہیں بھول گئے ہیں۔ امی نے گلے لگا کر دعائیں دیں۔
چچا کی ساس کو عزت سے بٹھایا اور پھر سب نے خوش ہو کر کھانا کھایا۔

چچا بُھلکڑ نے سفر کیا

راول پنڈی سے حُمیرا کی پھوپھی زاد بہن کی شادی کا بلاوا آیا۔ ڈاک کی گڑبڑ کی وجہ سے کارڈ دیر سے پہنچا۔ اس لیے جلدی میں خیبر میل کے نچلے درجے کا ٹکٹ ہی دستیاب ہو سکا۔ اوپر سے ریزرویشن بھی نہیں۔ مگر کیا کرتے، مجبوری تھی۔

ادھر چچا بُھلکڑ نے دفتر سے دو ہفتے کی چھٹی لے لی۔

''بس، آج ہی کا دن ہے، تیاری کر لو'' چچا بُھلکڑ نے بیوی سے کہا۔

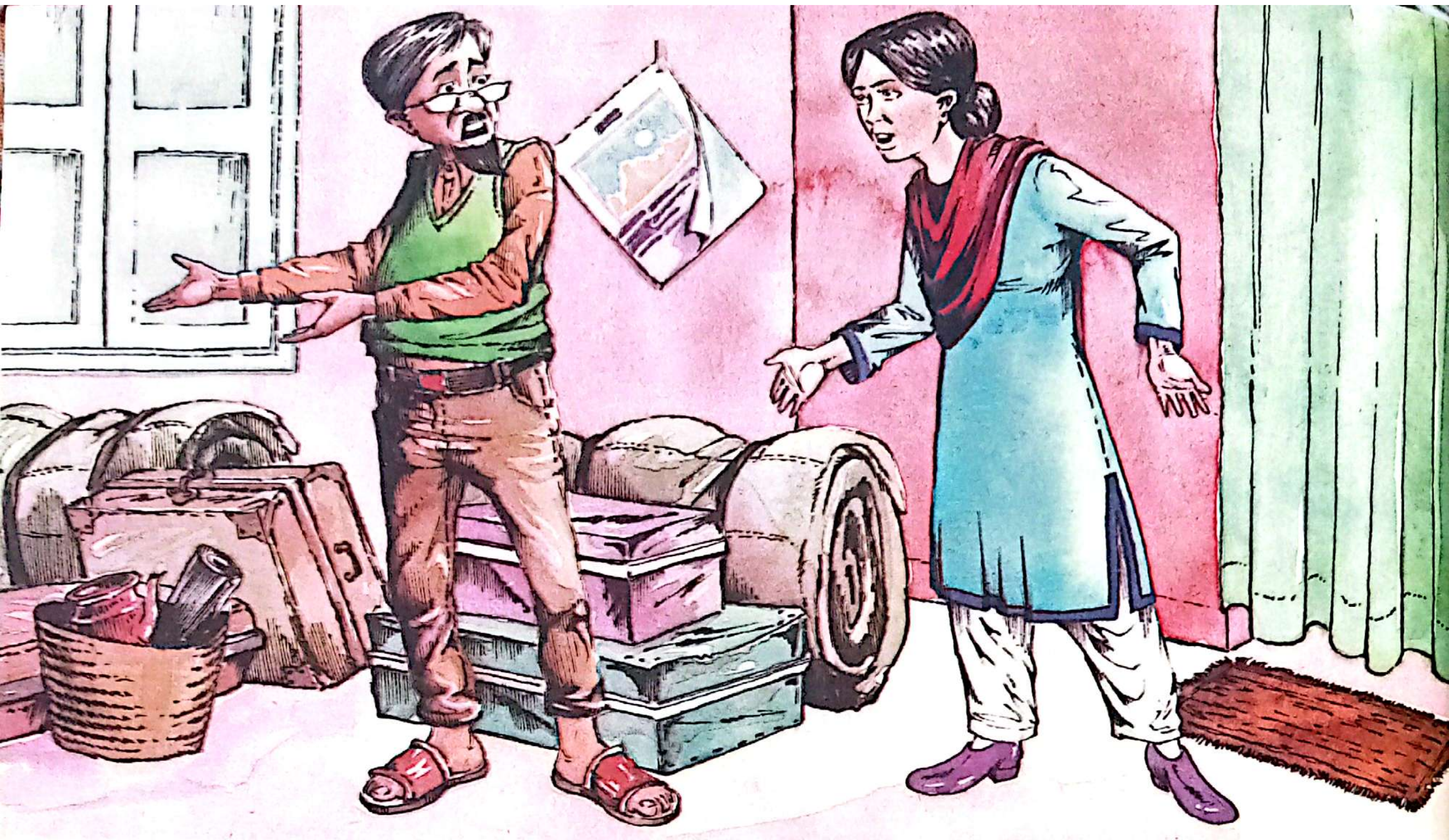
''میں کھانا پکا رہی ہوں۔ آپ ہی ضروری چیزیں رکھ لیں۔ میں ابھی آتی ہوں'' حُمیرا نے کہا۔ چچا بُھلکڑ بے چارے سیدھے سادے آدمی تھے۔ انہیں ہر چیز ضروری نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے بے شمار سامان اکٹھا کر لیا۔ دو عدد بستر بند تیار کیے۔ ایک بڑی ٹوکری میں بہت سے برتن رکھ لیے۔ کپڑوں کا بڑا بکس بھی گھسیٹ لائے۔ سب سامان برآمدے میں ڈھیر کر دیا۔ حُمیرا باورچی خانے کا کام ختم کر کے آئی تو دیکھا پورے گھر کا سامان برآمدے میں جمع ہے۔

''ارے! یہ آپ نے کیا کیا؟ دو بستر بند کس لیے، بھئی؟''

''پنڈی میں بہت بارشیں ہوتی ہیں۔ وہاں بہت سردی ہوگی۔

ایک بستر بند میں لحاف اور تکیے ہیں اور دوسرے میں روئی کے گدے۔''

''گدوں کی کیا ضرورت ہے؟ لحاف اور تکیے ہی کافی ہیں۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔''



''تم کیا جانو ان باتوں کو۔ دور اندیشی اچھی ہوتی ہے۔
پھر سامان تو قلی اٹھائے گا۔ تم کیوں فکر کرتی ہو؟''
''میں ہرگز دو بستر بند لے کر نہیں جاؤں گی، کوئی وجہ بھی ہو۔''
اتنے میں محلے کا بچہ ادرک مانگنے آ گیا۔ ''آنٹی تھوڑی سی ادرک دے دیجئے۔
امی مانگ رہی ہیں۔'' ''بیٹا ہمارے گھر تو ادرک نہیں ہے'' حمیرا نے کہا۔
بچہ واپس چلا گیا۔ مگر اس نے اپنے گھر میں کہہ دیا کہ چچا بُھلکڑ اس محلے سے جا رہے ہیں۔
سب سامان بندھا رکھا ہے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح محلے میں پھیل گئی۔ فوراً ہی
دروازے پر دستک ہوئی۔ حُمیرا نے دروازہ کھولا۔ احمد صاحب کی بیوی آئی ہیں۔
''ارے بھئی، سنا ہے تم لوگوں کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ تم یہاں سے جا رہے ہو۔''
''نہیں باجی۔ ہم تو پنڈی جا رہے ہیں۔ بہن کی شادی ہے۔''

''کتنے دنوں کے لیے جا رہے ہو؟'' ''ہفتہ بھر کے لیے۔''
''ہائے اللہ! مگر سامان تو سب بندھا پڑا ہے۔ پورے محلے میں یہی مشہور ہے کہ تم لوگ شہر چھوڑ کر جا رہے ہو۔''
''باجی یہ سب میاں جی کی کارستانی ہے۔ کیا کروں؟ میری بات کب سنتے ہیں۔''
بیگم احمد واپس گئیں تو دوسری آ گئیں۔ غرض کہ وضاحتیں کرتے کرتے حمیرا تھک گئی۔ سر میں درد ہو گیا۔ اب دوپہر ہو گئی تھی۔ کھانا کھا کر یہ لوگ لیٹ گئے۔
شام کو حمیرا نے صاف کہہ دیا ''میں اتنا سامان لے کر نہیں جاؤں گی۔ ریل میں بیٹھنے کی جگہ مل جائے تو وہی بہت ہے نہ کہ پورے گھر کا سامان۔''
''اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے جہیز کے کپڑے بھی نہیں لے جاؤ گی؟'' چچا بھلکڑ نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ ''شادی میں پہننے کے لیے دو تین جوڑے رکھ لوں گی۔ جہیز کا بکس کس خوشی میں گھسیٹ لائے؟''
''خیر، تمہاری جو مرضی آئے وہ کرو۔ خواہ مخواہ صبح سے تھک رہا تھا'' یہ کہہ کہ چچا ناراض ہو کر بیٹھ گئے۔ لیکن انہیں منانا کون سا مشکل کام تھا۔ حمیرا نے گرم گرم چائے کی پیالی لا کر دی تو میاں جی خوش ہو گئے اور پھر اچانک انہیں کچھ یاد آ گیا۔ چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی بولے ''میں تمہیں ایک چیز دکھانا تو بھول ہی گیا۔ میں شادی میں پہننے کے لیے تُرکی ٹوپی لایا ہوں خرید کر۔''
''لیکن آپ تو قمیص پتلون پہنیں گے۔ اس کے اوپر یہ ٹوپی۔۔۔؟''
''تو کیا ہوا؟ قمیص پتلون پر تُرکی ٹوپی نہیں پہنی جا سکتی؟ کس حکیم نے منع کیا ہے؟''

چچا سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ وہ اپنی مرضی کرنے کے عادی تھے۔ ترکی ٹوپی انہیں اتنی پسند آئی کہ ابھی سے سر پر رکھ لی۔ رات کا کھانا کھا کر اسٹیشن پہنچے تو خیبر میل کھڑی تھی۔ چونکہ نچلے درجے کا ٹکٹ تھا اس وجہ سے ڈبے میں مشکل سے جگہ مل پائی۔ کسی نہ کسی طرح یہ لوگ بھی ٹھنس گئے۔ چچا بُھلکڑ بہر حال خوش تھے کیونکہ انہیں کھڑکی کے پاس جگہ ملی تھی۔ یہاں سے وہ باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔

سفید کرتا پاجامہ، پاؤں میں چپل اور سر پر سرخ ترکی ٹوپی۔ وہ بڑے خوش نظر آرہے تھے۔ ڈبے میں بیٹھے سارے لوگوں کی نظریں انہی کی طرف تھیں۔ آخر کسی نہ کسی طرح ریل روانہ ہوئی۔ رات جیسے تیسے کٹی۔ دوسرا دن طلوع ہوا۔ دن نکلا تو سب نے ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھا اور بات چیت بھی شروع ہوئی۔ چچا بُھلکڑ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا ''میرا نام تو شاد علی ہے مگر محلے والے چچا کہتے ہیں۔'' چنانچہ ڈبے کے سارے مسافر بھی انہیں چچا کہنے لگے اور وہ بہت جلد سب مسافروں میں مقبول ہو گئے۔ کسی کے بچے کو بہلا رہے ہیں، کسی کو پانی لا کر دے رہے ہیں تو کسی کو چائے کے لیے پوچھ رہے ہیں۔

لوگوں نے چچا کی تعریفیں کیں تو وہ خوشی سے پھول گئے اور بولے ''آپ سب میری تعریف کر رہے ہیں۔ مگر میرے اندر ایک خرابی بھی ہے۔ میں کبھی کبھی بھول جاتا ہوں۔ بس جناب، سب کو میری یہی عادت یاد رہتی ہے۔ اب جسے دیکھو وہی چچا بُھلکڑ کے نام سے پکارتا ہے۔'' ان کی یہ بات سن کر سب ہنس پڑے۔

اب ریل کی رفتار کم ہو رہی تھی۔ غالباً کوئی اسٹیشن آنے والا تھا۔ پھر سچ مچ اسٹیشن آگیا۔ ریل رک گئی۔ پلیٹ فارم پر طرح طرح کی چیزیں بیچنے والے گھوم رہے تھے۔
حُمیرا نے اپنے پرس میں سے پچاس کا نوٹ نکال کر میاں کو دیا اور بولی
''ذرا پانچ روپے کی ٹافیاں تو خرید لائیے۔ منہ کا مزہ خراب ہو رہا ہے۔''

چچا بُھلکڑ پچاس کا نوٹ لے کر ٹافی والے کے پاس پہنچے لیکن پانچ کے بجائے پچاس روپے کی ٹافیاں خرید لیں۔ اتنے میں گاڑی نے سیٹی بجادی۔ چچا بُھلکڑ گھبرا کر بھاگے۔ جلدی میں اپنا ڈبا پہچان نہ پائے۔ جس ڈبے میں گھسے وہ کوئی اور ہی ڈبا تھا، مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ چچا بُھلکڑ کا حلیہ یہ تھا کہ میلا لباس، پرانی چپل، سر پر لال ٹوپی جس کا پھندنا کان کے پاس لٹک رہا تھا، ہاتھ میں ٹافیوں کی تھیلی۔

لوگوں نے سمجھا کہ ٹافی والا آیا ہے۔ بچے ماں باپ سے ضد کرنے لگے ''اماں، ٹافی، ٹافی، ٹافی۔'' ایک صاحب نے پکارا ''او، ٹوپی والے بھائی صاحب۔'' دوسرے نے آواز لگائی ''ارے پھندنے والے بھائی جی! ادھر آنا۔ چار ٹافیاں دے دو۔''
چچا بُھلکڑ کو غصہ آگیا۔ بولے ''میں ٹافیاں نہیں بیچتا۔ غلطی سے ڈبے میں آگیا ہوں۔ اگلے اسٹیشن پر واپس چلا جاؤں گا۔''

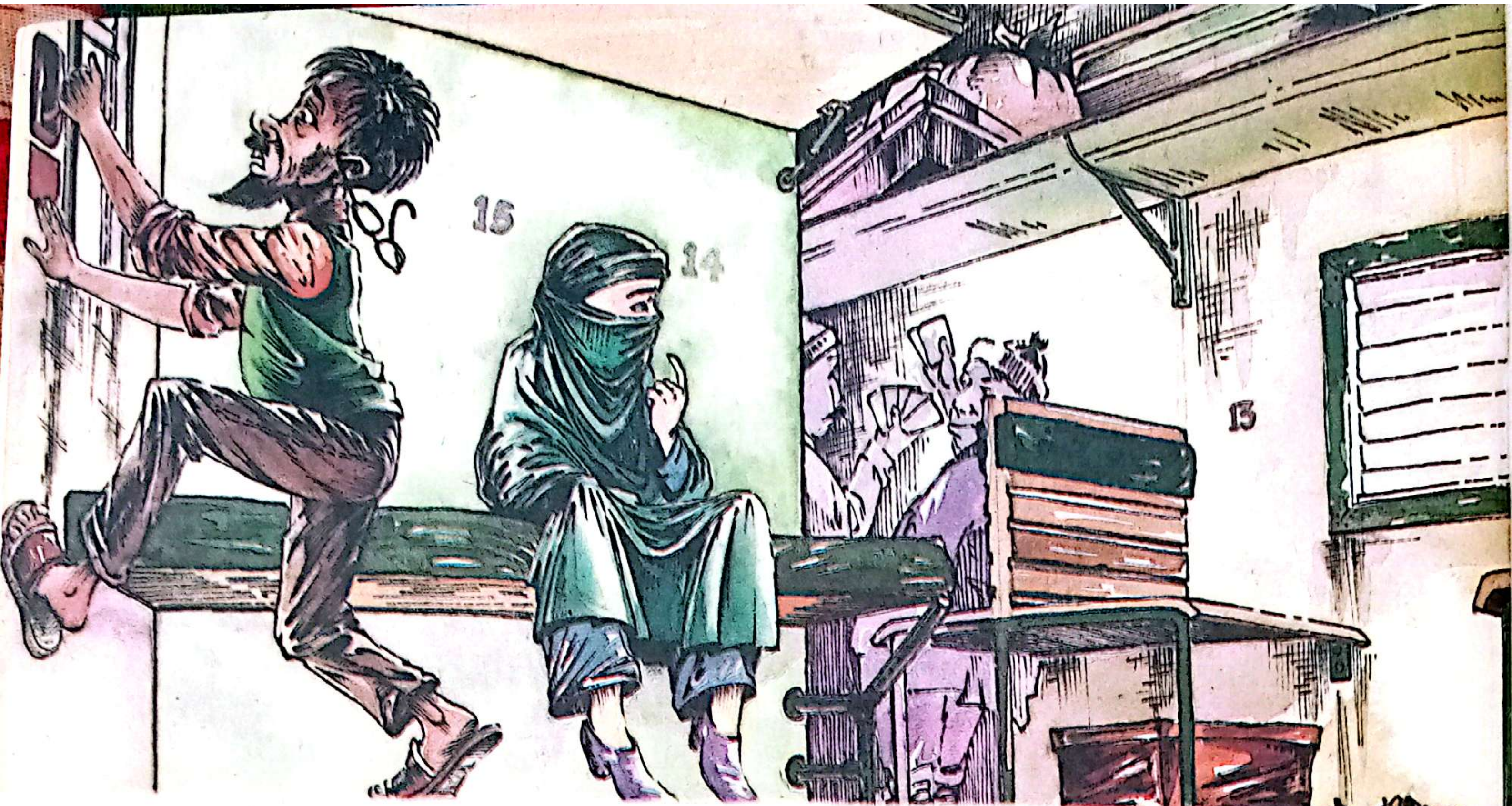
ایک بڑھیا بگڑ گئی، کہنے لگی ''اے ہے! اگر چار ٹافیاں بیچ دو گے تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ تم اور خرید لینا۔ یہ لو دو روپے اور چار ٹافیاں دے دو۔''
چچا بُھلکڑ نے چار آنے کے حساب سے ٹافیاں خریدی تھیں۔ یہاں دُگنے دام پر بک رہی تھیں۔ چنانچہ دل ہی دل میں خوش ہو گئے اور بڑھیا سے دو روپے لے کر اسے



چار ٹافیاں دے دیں۔ اب کیا تھا، چاروں طرف سے بچے چیخنے لگے۔ ہمیں بھی دو۔ ہمیں بھی دو۔ تھوڑی ہی دیر میں چچا کی آدھی ٹافیاں بک گئیں۔ اب ان کے ہاتھ میں پچاس روپے تھے اور آدھی ٹافیاں اب بھی موجود تھیں۔ دل ہی دل میں تجارت کرنے اور منافع کمانے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ اگلا اسٹیشن آگیا۔ چچا اتر گئے۔ برابر والے ڈبے سے بیوی کو جھانکتا دیکھا تو اسی میں چڑھ گئے۔ حُمیرا تو ڈری بیٹھی تھی۔ میاں کو دیکھ کر سکھ کا سانس لیا۔ ''ہائیں! اتنی بہت سی ٹافیاں؟''

''ہاں، اور یہ لو پچاس روپے بھی'' چچا نے بڑے فخر سے کہا۔ پھر جھوم جھوم کر دوسرے ڈبے کی روداد سنانے لگے۔ حُمیرا دَم سادھے سب کچھ سنتی رہی۔
حُمیرا کی سیٹ کے بائیں جانب جو سیٹ تھی اس پر دو مشکوک افراد بیٹھے تھے۔ کچھ عجیب طرح کے پُراسرار لوگ لگ رہے تھے۔ صورت بھی ڈراوَنی تھی۔

چچا بُھلکڑ سے تقریباً سب ہی نے بات چیت کی مگر وہ دونوں لا تعلق ہی بنے رہے۔
حُمیرا نے برقعہ پہنا ہوا تھا اور مردوں کی وجہ سے چہرے کو نقاب سے چھپا لیا تھا۔
اسے وہ دو آدمی بالکل بھروسے کے قابل نہیں لگ رہے تھے۔ ان کی حرکات بھی کچھ پُراسرار تھیں۔ دوپہر کو سب نے کھانا نکالا۔ حُمیرا نے بہت مزیدار کباب اور پراٹھے تیار کیے تھے۔ اس نے ٹوکری میں سے ناشتے دان نکالنا چاہا تو وہ نہ مل سکا۔
میاں سے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ گھر ہی بھول آئے ہیں۔
یہ آپ نے کیا غضب کیا؟ میں نے کتنی محنت سے کھانا تیار کیا تھا۔ اوہو! واقعی۔
بھول ہو گئی۔ خیر اب تو ریل کا کھانا ہی خریدنا پڑے گا۔ ایک کھانے میں صرف ایک روٹی تھی اور ایک سالن کی پلیٹ۔ تھوڑے سے چاول بھی تھے۔
اتنا کھانا حُمیرا کے لیے تو کافی سے زیادہ تھا مگر چچا بُھلکڑ بھلا کیا کرتے؟
انہوں نے اپنے لیے تین کھانوں کا آرڈر دیا۔
اب سب مسافر حیران کہ دو آدمی اور چار کھانوں کا آرڈر! وہ ان کی طرف مُڑ مُڑ کر دیکھنے لگے۔ حُمیرا اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہی تھی مگر کیا کرتی۔ چچا بُھلکڑ نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ ہاں بیرے کو روپے دیتے وقت ان کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔
اب دن کے پونے دو بجے تھے۔ کوئی چھوٹا اسٹیشن آیا تھا۔ گاڑی ذرا دیر کو رُکی تھی اور وہ دونوں پراسرار لوگ اچانک نیچے اتر گئے تھے۔
اُترنے سے پہلے انہوں نے بادامی رنگ کا ایک چوکور ڈبا سیٹ کے نیچے کھسکا دیا تھا۔
جسے کوئی نہ دیکھ سکا تھا۔ مگر حُمیرا نقاب کے اندر سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔



اچانک اس کی چھٹی حِس بیدار ہو گئی۔ وہ لوگ کون تھے؟ کیوں اتر گئے؟ یہ ڈبا کیسا ہے؟
اور پھر جیسے اس کو خطرے کا احساس ہوا۔ ان دنوں ویسے بھی ریل گاڑیوں میں
تخریب کاری کے واقعات عام تھے۔ ہو سکتا ہے اس ڈبے میں کوئی ٹائم بم ہو!
مجھے دیر نہیں کرنی چاہیے۔ زنجیر کھینچ لینی چاہیے۔ مگر قبل اس کہ کہ حُمیرا زنجیر کھینچتی
چچا بُھلکڑ نے زنجیر کھینچ دی۔

اوہ! شاید انہیں بھی احساس ہو گیا۔ حُمیرا نے سوچا۔ چند منٹ بعد ریل اچانک رُک گئی۔
کچھ لوگ اس ڈبے میں آ گئے۔ یہ سیکورٹی گارڈ کے لوگ تھے۔ انہوں نے پوچھا
''کیوں جناب؟ کس نے زنجیر کھینچی ہے؟''

''میں نے کھینچی ہے'' چچا بُھلکڑ نے سینہ تان کر کہا۔

''کیوں؟ کس لیے؟'' ابھی چچا بُھلکڑ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ حُمیرا بول پڑی۔

''میں بتاتی ہوں۔ وہ دیکھئے، اس سیٹ کے نیچے کوئی ڈبا ہے۔ دو مسافر کراچی سے سوار

ہوئے تھے۔ اچانک اتر گئے اور یہ ڈبا چپکے سے یہاں رکھ گئے۔"

حُمیرا کی اس بات سے سب چوکس ہو گئے۔ سیکورٹی گارڈ کے عملے نے ڈبے کو احتیاط سے کھولا۔ اُف! اس میں ٹائم بم تھا جس پر دو بجے وقت مقرر کیا گیا تھا اور اب دو بجنے میں صرف ایک منٹ باقی تھا۔ اس ڈبے کو دور لے جا کر پھینکنے میں چند سیکنڈ لگے اور پھر مقررہ وقت پر بم پھٹ گیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ ریل گاڑی کے مسافر بچ گئے۔ کسی وطن دشمن کی ناپاک اسکیم کامیاب نہ ہو سکی۔

سب لوگ چچا بُھلکڑ کی تعریف کر رہے تھے۔ خوب واہ واہ ہو رہی تھی۔ حُمیرا اس بات پر خوش ہو رہی تھی کہ لوگ تو اُول جلول اور بے وقوف کہتے ہیں لیکن خطرے کا احساس کر کے مجھ سے پہلے ہی زنجیر کھینچ دی۔

کچھ دیر بعد ریل پھر چل پڑی۔ سارے مسافر خوش تھے لیکن چچا بُھلکڑ کے منہ پر بارہ بج رہے تھے۔ حُمیرا کو سخت تعجب ہوا۔ وہ بولی "آپ کیوں اداس ہیں؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے کہ آپ کی وجہ سے۔۔۔' "بات وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو" چچا نے آہستہ سے کہا۔ "پھر کیا بات ہے؟" "میں نے زنجیر اس لیے کھینچی تھی کی میری ترکی ٹوپی کھڑکی سے نیچے گر گئی تھی۔ یہاں دوسرا ہی چکر نکل آیا۔ میں بھی مُروّت میں کچھ نہ بول سکا۔ افسوس! میری ٹوپی!۔۔۔" شوہر کے یہ الفاظ حُمیرا کا دل دکھانے کے لیے کافی تھے۔ وہ تو غنیمت تھا کہ دوسرے لوگوں نے یہ بات نہیں سنی ورنہ بہت شرمندگی ہوتی۔ "شاید لوگ ان بے چارے کو جو کچھ بھی کہتے ہیں، ٹھیک ہی کہتے ہیں" حُمیرا نے ٹھنڈی سانس بھری اور کھڑکی کے باہر دوڑتے بھاگتے درختوں کو دیکھنے لگی۔

ملکیت حکومتِ پنجاب

اُلٹا نگر کے موٹو شاہ

بچّوں کو تو ہنسنے کا موقع ملنا چاہیے۔ بچّوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنے کے لئے یہ مزاحیہ کہانیاں حاضر ہیں۔

''چچا بُھلکڑ'' مزاحیہ کہانیوں کا ایک مشہور کردار ہیں۔ جو نام کی طرح ہر کام بھول جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی نئی نویلی دلہن بھی۔ پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ وار واقعات و حالات رونما ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جن سے بڑے تو تنگ ہوتے ہیں مگر بچّے تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔

''چچا بُھلکڑ'' اور ''اُلٹا نگر کے موٹو شاہ'' دو ایسی مزاحیہ کہانیاں ہیں جو آپ کو ہنسنے پر مجبور کر دیں گی۔ آزمائش شرط ہے۔
پڑھیں اور پھر ہنسیں اور ہنسائیں!

DFID Department For International Development

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

PMSP Punjab

969 0 01630 X